# لا=انسان

ن م راشد

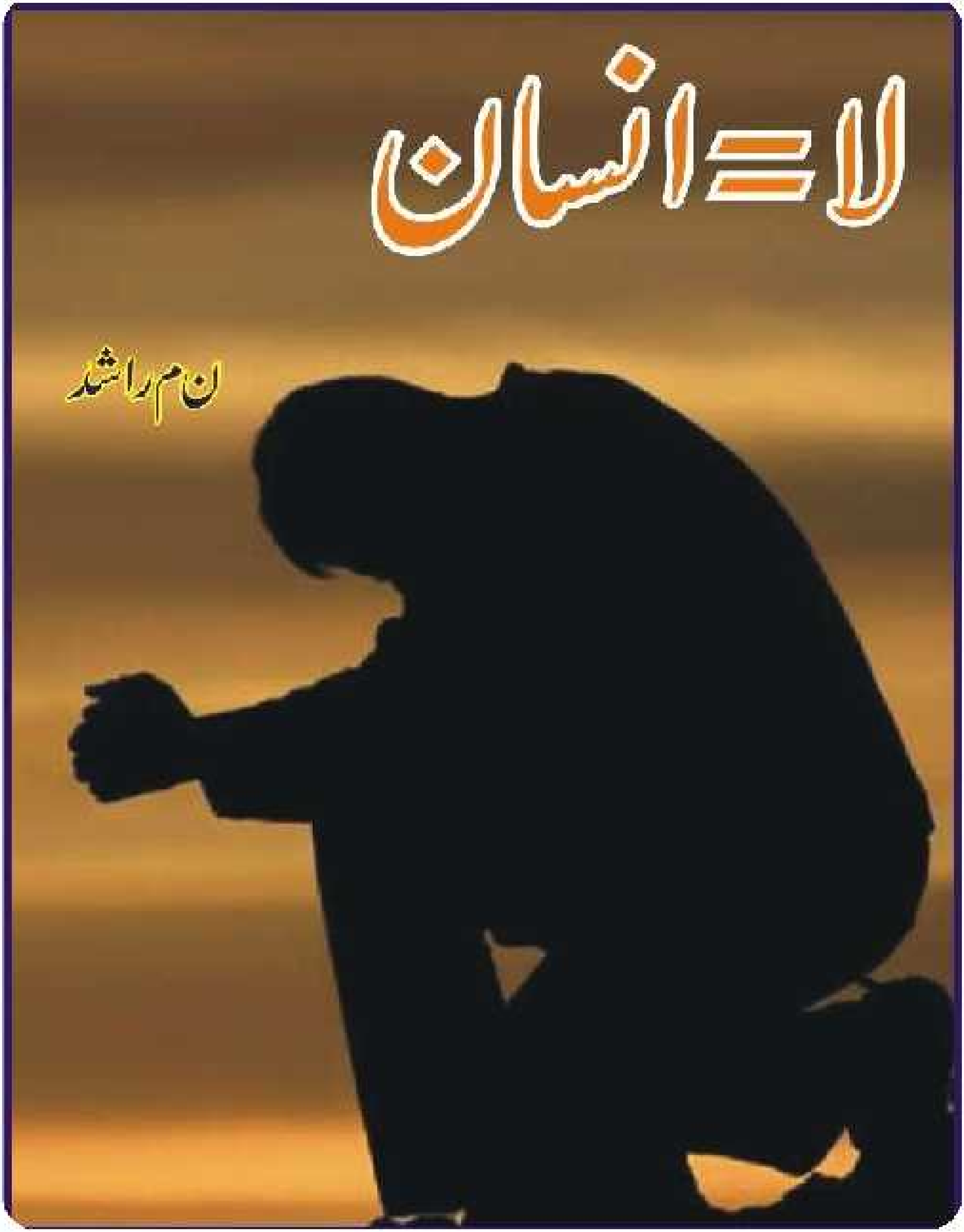

# حسن کوزہ گر

جہاں زاد، نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی تھی
میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد، نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
یہ وہ دور تھا جس میں میں نے
کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا
وہ کوزے مرے دست چابک کے پتلے
گل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے
''حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟
وہ ہم سے خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں!
جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا
کہ جیسے کسی شہر مدفون پر وقت گزرے

تغاروں میں مٹی
کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں سنگ بستہ پڑی تھی
صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں
مری ہیچ مایہ معیشت کے، اظہار فن کے سہارے
شکستہ پڑے تھے
میں خود، میں حسن کوزہ گر پا بہ گل خاک بر سر برہنہ
سر ''چاک'' ژولیدہ مو، سر بزانو
کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے
گل و لا سے خوابوں کے سیال کوزے بناتا رہا تھا
جہاں زاد، نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے، حسن کوزہ گر نے
تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں، ابر و مہتاب کا
رہگزر بن گئے تھے
جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رود دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی

کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود
اس کی جان اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے

جہاں زاد اس دور میں روز، ہر روز وہ سوختہ بخت آ کر
مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گل سر بزانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی
(وہی چاک جو سالہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا!)
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی
"حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر
یہ بچوں کے تنور کیونکر بھریں گے
حسن، اے محبت کے مارے
محبت امیروں کی بازی
حسن، اپنے دیوار و در پر نظر کر"
مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیر گرداب کوئی پکارے
وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں
مگر میں حسن کوزہ گر شہر اوہام کے ان
خرابوں کا مجذوب تھا جن
میں کوئی صدا کوئی جنبش

کسی مرغ پراں کا سایہ
کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا

جہاں زاد میں آج تیری گلی میں
یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں
ترے در کے آگے کھڑا ہوں
سر و مو پریشاں
دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں
مجھے آج پھر جھانکتی ہیں
زمانہ جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں
میں انساں ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!
حسن کوزہ گر آج اک تودہ خاک ہے جس
میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف
کی دکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں
ان آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اٹھی ہے پھر تودہ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش
یہی شاید اس خاک کو گل بنا دے

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن

تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ وکو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گل ولا کے سوکھے تغاروں کی جانب
معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گل ولا سے، اس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن!

◆◆◆

# مہمان

میں اس شہر مہمان اترا
تو سینے میں غم اور آنکھوں میں آنسو کے طوفاں
جدائی سے ہر چیز، حسن ازل تک وہ پردہ
کہ جس کے ورا حیرت خیرگی تھی!
جدائی سے تو بھی حزیں
اور ترا زخم مجھ سے بھی گہرا تھا خوں دادہ تر تھا!

میں مبہم سی امید تو ساتھ لایا تھا لیکن
تو اک شاخسار شکستہ کے مانند بے آرزو
وہ بے آرزوئی کا گہرا خلوص جس کو میں نے
کبھی ذہن بے مایہ جانا
کبھی خوف و نفرت کے عفریت کا سایہ جانا

تجھے یاد محبوب کا نرم راحت سے لبریز بالش
تجھے یاد کمرے کے شام و پگا، جن میں تو نے
ستاروں کے خوشوں کی آواز دیکھی
بنفشے کے رنگوں کو تو نے چکھا
اور بہشتی پرندوں کے نغموں کو چھوتی رہی

تجھے اس کی پرواز کی آخری رات بھی یاد تھی
لذت وغم سے بے خواب لمحے
جو صدیوں سے بھرپور صدیوں کی
پہنائی بنتے چلے جا رہے تھے

ادھر میں وہ مجبور افسردہ تنہا
وہ شبنم کا قطرہ
جو صحرا میں نازل ہو لیکن
سمندر سے ملنے کا رویا لیے ہو

میں افسردہ مجبور تنہا
کہ محبوب سے بعد کو نور کے سالہا سال سے
ناپتا آ رہا تھا
مگر نور کے سال اک خط پیمانہ بھی تو
نہیں بن سکے تھے

نئی سرزمیں کی نئی اجنبی
تجھے میں نے اک خواب پیا کی آنکھوں سے دیکھا
کہ اس روز تجھ کو عیاں دیکھنا
ایسا الحاد ہوتا
کہ جس کی سزا جسم و جاں سہہ نہ سکتے!

مگر میرے دل نے کہا
اجنبی شہر کی خلوت بے نہایت میں تو بھی
کسی روز بن کر رہے گی
ستم ہائے تازہ کی خواہش کا پرتو!
زخود رفتگی سے، اشاروں سے ترغیب واسے
تجھے میں بلاتا رہا تھا
تو آہستہ، خاموش بڑھنے لگی تھی
کہ یادیں ابھی تک ترے دل میں یوں گونجتی تھیں
کہ ہم گوش برلب سہی
سن نہ سکتے تھے اک دوسرے کی صدائیں

مگر جب ملے ہم تو ایسے ملے
وہ تری خودنگہداریاں کام آئیں
نہ میرا تذبذب مجھے راس آیا
ہم ایسے ملے جیسے صدیوں کے مہجور
آدم کے جشن ولایت کے مہجور
باہم ابد میں ملیں گے

◆ ◆ ◆

# ریگ دیروز

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طول الم ناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل، نور ابد سے خالی
ہم جو صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ساحل پایا
اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا

ہم محبت کے نہاں خانوں میں بسنے والے
اپنی پامالی کے افسانوں پہ ہنسنے والے
ہم سمجھتے ہیں نشان سر منزل پایا
ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
کنج ماضی میں ہیں باراں زدہ طائر کی طرح آسودہ
اور کبھی فتنۂ ناگاہ سے ڈر کر چونکیں
تو رہیں سد نگاہ نیند کے بھاری پردے

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
ایسے تاریک خرابے کہ جہاں
دور سے تیز پلٹ جائیں ضیا کے آہو
ایک، بس ایک، صدا گونجتی ہو

شب آلام کی ''یاہو! یاہو!''

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
ریگ دیروز میں خوابوں کے شجر بوتے رہے
سایہ ناپید تھا' سائے کی تمنا کے تلے سوتے رہے

◆ ◆ ◆

# ایک اور شہر

خودفہمی کا ارماں ہے تاریکی میں روپوش
تاریکی خود بے چشم و گوش!
اک بے پایاں عجلت راہوں کی الوند

سینوں میں دل یوں جیسے چشم آزِ صیاد
تازہ خوں کے پیاسے افرنگی مردان راد
خود دیو آہن کے مانند

دریا کے دو ساحل ہیں اور دونوں ہی ناپید
شر ہے دست سیہ اور خیر کا حامل روئے سفید!
اک بار شرگاں، اک لب خند

سب پیمانے بے صرفہ جب سیم و زر میزان
جب ذوق عمل کا سرچشمہ بے معنی ہذیان
جب وحشت ہر لمحہ جان کند!
یہ سب افقی انسان ہیں، یہ ان کے سماوی شہر
کیا پھر ان کی کمیں میں وقت کے طوفاں کی اک لہر؟
کیا سب ویرانی کے دل بند؟

◆◆◆

# ابولہب کی شادی

شبِ زفاف ابولہب تھی، مگر خدایا وہ کیسی شب تھی
ابولہب کی دلہن جب آئی تو سر پہ ایندھن، گلے میں
سانپوں کے ہار لائی، نہ اس کی مشاطگی سے مطلب
نہ مانگ غازہ، نہ رنگ روغن، گلے میں سانپوں
کے ہار اس کے، تو سر پہ ایندھن
خدایا کیسی شبِ زفاف ابولہب تھی

یہ دیکھتے ہی ہجوم بپھرا، بھڑک اٹھے یوں غضب
کے شعلے، کہ جیسے ننگے بدن پہ جابر کے تازیانے
جوان لڑکوں کی تالیاں تھیں، نہ صحن میں شوخ
لڑکیوں کے تھرکتے پاؤں تھرک رہے تھے
نہ نغمہ باقی نہ شادیانے

ابولہب نے یہ رنگ دیکھا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!
ابولہب کی خبر جو آئی، تو سالہا سال کا زمانہ
غبار بن کر بکھر چکا تھا

ابولہب اجنبی زمینوں کے لعل و گوہر سمیٹ کر
پھر وطن کو لوٹا، ہزار طرار و تیز آنکھیں، پرانے
غرفوں سے جھانک اٹھیں، ہجوم، پیر و جواں کا
گھرا ہجوم، اپنے گھروں سے نکلا، ابولہب کے جلوس
کو دیکھنے کو لپکا

"ابولہب!" اک شب زفاف ابولہب کا جلا
پھپھولا، خیال کی ریت کا بگولا، وہ عشق برباد
کا ہیولا، ہجوم میں سے پکار اٹھی "ابولہب
تو وہی ہے جس کی دلہن جب آئی، تو سر پہ ایندھن
گلے میں سانپوں کے ہار لائی

ابولہب ایک لمحہ ٹھٹکا، لگام تھامی، لگائی
مہمیز، ابولہب کی خبر نہ آئی!

◆ ◆ ◆

# دل، مرے صحرانود پیر دل

نغمہ در جاں، رقص بر پا، خندہ بر لب
دل، تمناؤں کے بے پایاں الاؤ کے قریب

دل، مرے صحرانورد پیر دل
ریگ کے دلشاد شہری، ریگ تو
اور ریگ ہی تیری طلب
ریگ کی نکہت ترے پیکر میں، تیری جاں میں ہے!

ریگ صبح عید کے مانند زرتاب و جلیل
ریگ صدیوں کا جمال
جشن آدم پر بچھڑ کر ملنے والوں کا وصال
شوق کے لمحات کے مانند آزاد و عظیم!

ریگ نغمہ زن
کہ ذرے ریگ زاروں کی وہ پازیب قدیم
جس پہ پڑ سکتا نہیں دست لئیم
ریگ صحرا زرگری کی ریگ کی لہروں سے دور
چشمہ مکر و ریا شہروں سے دور!

ریگ شب بیدار ہے، سنتی ہے ہر جابر کی چاپ
ریگ شب بیدار ہے، نگراں ہے مانند نقیب
دیکھتی ہے سایہ آمر کی چاپ
ریگ ہر عیار، غارت گر کی موت
ریگ استبداد کے طغیاں کے شور و شر کی موت
ریگ جب اٹھتی ہے، اڑ جاتی ہے ہر فاتح کی نیند
ریگ کے نیزوں سے زخمی، سب شہنشاہوں کے خواب!
ریگ، اے صحرا کی ریگ
مجھ کو اپنے جاگتے ذروں کے خوابوں کی نئی تعبیر دے
ریگ کے ذرو، ابھرتی صبح تم
آؤ صحرا کی حدوں تک آ گیا روز طرب
دل، مرے صحرا نورد پیر دل
آ چوم ریگ!
ہے خیالوں کے پری زادوں سے بھی معصوم ریگ!

ریگ رقصاں، ماہ و سال نو تک رقصاں رہے
اس کا بریشم ملائم، نرم خو، خنداں رہے!

دل، مرے صحرا نورد پیر دل
یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ
راہ گم کردوں کی مشعل، اس کے لب پر "آؤ! آؤ!"

تیرے ماضی کے خزف ریزوں سے جاگی ہے یہ آگ
آگ کی قرمز زباں پر انبساط نو کے راگ
دل، مرے صحرا نورد پیر دل
سرگرانی کی شب رفتہ سے جاگ
کچھ شرر آغوش صرصر میں ہیں گم
اور کچھ زینہ بہ زینہ شعلوں کے مینار پر چڑھتے ہوئے
اور کچھ تہہ میں الاؤ کی ابھی
مضطرب، لیکن بذبذب طفل کمسن کی طرح
آگ زینہ، آگ رنگوں کا خزینہ
آگ ان لذات کا سرچشمہ ہے
جس سے لیتا ہے غذا عشاق کے دل کا تپاک
چوب خشک انگور، اس کی مے ہے آگ
سرسراتی ہے رگوں میں عید کے دن کی طرح

آگ کاہن یاد سے اتری ہوئی صدیوں کی یہ افسانہ خواں
آنے والے قرنہا کی داستانیں لب پہ ہیں
دل، مرا صحرا نورد پیر دل سن کر جواں!

آگ آزادی کا، دلشادی کا نام
آگ پیدائش کا، افزائش کا نام
آگ کے پھولوں میں نسریں، یاسمن سنبل شقیق و نسترن

آگ آرائش کا، زیبائش کا نام
آگ وہ تقدیس، ڈھل جاتے ہیں جس سے سب گناہ
آگ انسانوں کی پہلی سانس کے مانند اک ایسا کرم
عمر کا اک طول بھی جس کا نہیں کافی جواب
یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
اس لق ودق میں نکل آئیں کہیں سے بھیڑیے
اس الاؤ کو سدا روشن رکھو
(ریگ صحرا کو بشارت ہو کہ زندہ ہے الاؤ
بھیڑیوں کی چاپ تک آتی نہیں)

آگ سے صحرا کا رشتہ ہے قدیم
آگ سے صحرا کے ٹیڑھے، رینگنے والے
گرد آلود، ژولیدہ درخت
جاگتے ہیں نغمہ درجاں، رقص برپا، خندہ برلب
اور منا لیتے ہیں تنہائی میں جشن ماہتاب
ان کی شاخیں غیر مرئی طبل کی آواز پر دیتی ہیں تال
بیخ و بن سے آنے لگتی ہے خداوندی جلاجل کی صدا

آگ سے صحرا کا رشتہ ہے قدیم
رہرؤں صحرا نوردوں کے لیے ہے رہنما
کاروانوں کا سہارا بھی ہے آگ

اور صحراؤں کی تنہائی کو کم کرتی ہے آگ
آگ کے چاروں طرف پشمینہ دستار میں لپٹے ہوئے افسانہ گو
جیسے گرد چشم مژگاں کا ہجوم
ان کے حیرت ناک، دلکش تجربوں سے جب دمک اٹھتی ہے ریت
ذرہ ذرہ بجنے لگتا ہے مثال ساز جاں
گوش برآواز رہتے ہیں درخت
اور ہنس دیتے ہیں اپنی عارفانہ بے نیازی سے کبھی

یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
ریگ اپنی خلوت بے نور و خود بیں میں رہے
اپنی یکتائی کی تحسیس میں رہے
اس الاؤ کو سدا روشن رکھو

یہ تمناؤں کا بے پایاں الاؤ گر نہ ہو
ایشیا، افریقہ پہنائی کا نام
(بے کار پہنائی کا نام)
یورپ اور امریکہ دارائی کا نام
(تکرار دارائی کا نام!)
میرا دل، صحرا نورد پیر دل
جاگ اٹھا ہے، مشرق و مغرب کی ایسی یک دلی کے کاروانوں کا نیا رویا لیے
یک دلی ایسی کہ ہوگی فہم انساں سے ورا

یک دلی ایسی کہ ہم سب کہہ اٹھیں
''اس قدر عجلت نہ کر
اژدہام گل نہ بن!''
کہہ اٹھیں ہم
تو غم کل تو نہ تھی
اب لذت کل بھی نہ بن
روز آسائش کی بے دردی نہ بن
یک دلی بن، ایسا سناٹا نہ بن
جس میں تابستاں کی دوپہروں کی
بے حاصل کسالت کے سوا کچھ بھی نہ ہو!''

اس ''جفاگر'' یک دلی کے کارواں یوں آئیں گے
دست جادوگر سے جیسے پھوٹ نکلے ہوں طلسم
عشق حاصل خیز سے، یا زور پیدائی سے جیسے ناگہاں
کھل گئے ہوں مشرق و مغرب کے جسم
جسم، صدیوں کے عقیم

کارواں فرخندہ پے، اور ان کا بار
کیسہ کیسہ تخت جم اور تاج کے
کوزہ کوزہ فرد کی سطوت کی مے
جامہ جامہ روز و شب محنت کا خے

## نغمہ نغمہ حریت کی گرم لے

ساکنو' فیروز بختو' آنے والے قافلو
شہر سے لوٹو گے تم تو پاؤ گے
ریت کی سرحد پہ جو روح ابد خوابیدہ تھی
جاگ اٹھی ہے ''شکوہ ہائے نے'' سے وہ
ریت کی تہہ میں جو شرمیلی سحر روئیدہ تھی
جاگ اٹھی ہے حریت کی لے سے وہ!

اتنی دوشیزہ تھی' اتنی مرد نادیدہ تھی صبح
پوچھ سکتے تھے نہ اس کی عمر ہم
درد سے ہنستی نہ تھی
ذروں کی رعنائی پہ بھی ہنستی نہ تھی
ایک محجوبانہ بے خبری میں ہنس دیتی تھی صبح
اب مناتی ہے وہ صحرا کا جلال
جیسے عزوجل کے پاؤں کی یہی محراب ہو!
زیر محراب آ گئی ہو اس کو بیداری کی رات
خود جناب عزوجل سے جیسے امید زفاف
(سارے ناکردہ گناہ اس کے معاف)
صبح صحرا' شاد باد
اے عروس عزوجل' فرخندہ رو' تابندہ خو

تو اک ایسے حجرہ شب سے نکل کر آئی ہے
دست قاتل نے بہایا تھا جہاں ہر سیج پر
سینکڑوں تاروں کا رخشندہ لہو پھولوں کے پاس
صبح صحرا، سر مرے زانو پہ رکھ کر داستاں
ان تمنا کے شہیدوں کی نہ کہہ
ان کی نیمہ رس امنگوں، آرزوؤں کی نہ کہہ
جن سے ملنے کا کوئی امکاں نہیں
شہر تیرا جن کو نوش جاں نہیں!
آج بھی کچھ دور، اس صحرا کے پار
دیو کی دیوار کے نیچے نسیم
روز و شب چلتی ہے مبہم خوف سے سہمی ہوئی
جس طرح شہروں کی راہوں پر یتیم
نغمہ بر لب تا کہ ان کی جاں کا سناٹا ہو دور!

آج بھی اس ریگ کے ذروں میں ہیں
ایسے ذرے، آپ ہی، اپنے غنیم
آج بھی اس آگ کے شعلوں میں ہیں
وہ شرر جو اس کی تہہ میں پر بریدہ رہ گئے
مثل حرف ناشنیدہ رہ گئے!
صبح صحرا، اے عروس عزوجل
آ کہ ان کی داستاں دہرائیں ہم

ان کی عزت، ان کی عظمت گائیں ہم

صبح، ریت اور آگ، ہم سب کا جلال
یک دلی کے کارواں ان کا جمال
آؤ!
اس تہلیل کے حلقے میں ہم مل جائیں
آؤ!
شاد باغ اپنی تمناؤں کا بے پایاں آلاؤ!

◆ ◆ ◆

# اسرافیل کی موت

مرگ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ خداؤں کا مقرب، وہ خداوند کلام
صوت انسانی کی روح جاوداں
آسمانوں کی ندائے بے کراں
آج ساکت مثل حرف ناتمام
مرگ اسرافیل پر آنسو بہاؤ

آؤ، اسرافیل کے اس خواب بے ہنگام پر آنسو بہائیں
آرمیدہ ہے وہ یوں قرنا کے پاس
جیسے طوفاں نے کنارے پر اگل ڈالا اسے
ریگ ساحل پر، چمکتی دھوپ میں، چپ چاپ
اپنے صور کے پہلو میں وہ خوابیدہ ہے!
اس کی دستار، اس کے گیسو، اس کی ریش
کیسے خاک آلودہ ہیں تھے کبھی جن کی تہیں بودونبود!
کیسے اس کا صور، اس کے لب سے دور
اپنی چیخوں، اپنی فریادوں میں گم
جھلملا اٹھتے تھے جس سے دیروزود

مرگ اسرافیل پر آنسو بہاؤ
وہ مجسم ہمہمہ تھا، وہ مجسم زمزمہ
وہ ازل سے تا ابد پھیلی ہوئی غیبی صداؤں کا نشاں!

مرگ اسرافیل سے
حلقہ در حلقہ فرشتے نوحہ گر
ابن آدم زلف در خاک و نزار
حضرت یزداں کی آنکھیں غم سے تار
آسمانوں کی صفیر آتی نہیں
عالم لاہوت سے کوئی نفیر آتی نہیں!
مرگ اسرافیل سے
اس جہاں پر بند آوازوں کا رزق
مطربوں کا رزق، اور سازوں کا رزق
اب مغنی کس طرح گائے گا اور گائے گا کیا
سننے والوں کے دلوں کے تار چپ!
اب کوئی رقاص کیا تھرکے گا، لہرائے گا کیا
بزم کے فرش و در و دیوار چپ!
اب خطیب شہر فرمائے گا کیا
مسجدوں کے آستان و گنبد و مینار چپ
فکر کا صیاد اپنا دام پھیلائے گا کیا
طائران منزل و کہسار چپ!

مرگ اسرافیل ہے
گوش شنوا کی، لب گویا کی موت
چشم بینا کی، دل دانا کی موت
تھی اس کے دم سے درویشوں کی ساری ہاؤ ہو
اہل دل کی اہل دل سے گفتگو
اہل دل جو آج گوشہ گیر و سرمہ در گلو
اب تنانا ہو بھی غائب اور یارب ہا بھی گم
اب گلی کوچوں کی ہر آوا بھی گم
یہ ہمارا آخری ملجا بھی گم

مرگ اسرافیل سے
اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا، پتھرا گیا
جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا
ایسی تنہائی کہ حسن تام یاد آتا نہیں
ایسا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں!
مرگ اسرافیل
دیکھتے رہ جائیں گے دنیا کے آمر بھی
زباں بندی کے خواب
جس میں مجبوری کی سرگوشی تو ہو
اس خداوندی کے خواب!

◆ ◆ ◆

# میرے بھی ہیں کچھ خواب

اے عشق ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
اس دور سے، اس دور کے سوکھے ہوئے دریاؤں سے
پھیلے ہوئے صحراؤں سے اور شہروں کے ویرانوں سے
ویرانہ گروں سے میں حزیں اور اداس
اے عشق ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
اے عشق ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب کہ اسرار نہیں جنکے ہمیں آج بھی معلوم
وہ خواب جو آسودگی مرتبہ و جاہ سے
آلودگی گرد سر راہ سے معصوم
جو زیست کی بے ہودہ کشاکش سے بھی ہوتے نہیں معدوم
خود زیست کا مفہوم!

اے عشق ازل گیر و ابد تاب
اے کاہن دانشور و عالی گہر و پیر
تو نے ہی بتائی ہمیں ہر خواب کی تعبیر

تو نے ہی بجھائی غم دلگیر کی تسخیر
ٹوٹی ترے ہاتھوں ہی سے ہر خواب کی زنجیر
اے عشق ازل گیروابدتاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

اے عشق ازل گیروابدتاب
کچھ خواب کے مدفون ہیں اجداد کے خودساختہ اسمار کے نیچے
اجڑے ہوئے مذہب کے بنا ریختہ اوہام کی دیوار کے نیچے
شیراز کے مجذوب تنک جام کے افکار کے نیچے
تہذیب نگونسار کے آلام کے انبار کے نیچے!

کچھ خواب ہیں آزاد مگر بڑھتے ہوئے نور سے مرعوب
نے حوصلہ خواب ہے، نے ہمت ناخوب
گر ذات سے بڑھ کر نہیں کچھ بھی انھیں محبوب
ہیں آپ ہی اس ذات کے جاروب
ذات سے محجوب

کچھ خواب ہیں جو گردش آلات سے جو بندہ تمکین
ہے جن کے لیے بندگی قاضی حاجات سے اس دہر کی تزئین
کچھ جن کے لیے غم کی مساوات سے انسان کی تائیں
کچھ خواب کہ جن کا ہوس جور ہے آئین

دنیا ہے نہ دین

کچھ خواب ہیں پروردہ انوار، مگر ان کی سحر گم
جس آگ سے اٹھتا ہے محبت کا خمیر، اس کے شرر گم
ہے کل کی خبر ان کو مگر جز کی خبر گم
یہ خواب ہیں وہ جن کے لیے مرتبہ دیدہ تر ہیچ
دل ہیچ ہے، سر اتنے برابر ہیں کہ سر ہیچ
عرض ہنر ہیچ

اے عشق ازل گیر و ابد تاب
یہ خواب مرے خواب نہیں ہیں کہ مرے خواب ہیں کچھ اور
کچھ اور مرے خواب ہیں، کچھ اور مرا دور
خوابوں کے نئے دور میں، نے مور و ملخ، نے اسد و ثور
نے لذت تسلیم کسی میں نہ کسی کو ہوس جور
سب کے نئے طور

اے عشق ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
ہر خواب کی سوگند
ہر چند کہ وہ خواب ہیں سربستہ و در بند
سینے میں چھپائے ہوئے گویائی دوشیزہ لب خند

ہر خواب میں اجسام سے افکار کا مفہوم سے گفتار کا پیوند
عشاق کے لب ہائے ازل تشنہ کی پیوستگی شوق کے مانند
(اے لمحہ خورسند)

اے عشق ازل گیر و ابد تاب، میرے بھی ہیں کچھ خواب
وہ خواب ہیں آزادی کامل کے نئے خواب
ہر سعی جگر دوز کے حاصل کے نئے خواب
آدم کی ولادت کے نئے جشن پہ لہراتے جلاجل کے نئے خواب
اس خاک کی سطوت کی منازل کے نئے خواب
یا سینہ گیتی میں نئے دل کے نئے خواب
اے عشق ازل گیر و ابد تاب
میرے بھی ہیں کچھ خواب
میرے بھی ہیں کچھ خواب

◆ ◆ ◆

# آئینہ حس وخبر سے عاری

آئنہ حس وخبر سے عاری
اس کے نابود کو ہم ہست بنائیں کیسے؟
منحصر ہست تگاپوئے شب وروز پہ ہے
دل آئینہ کو آئینہ دکھائیں کیسے؟
دل آئینہ کی پہنائی بے کار پہ ہم روتے ہیں
ایسی پہنائی کہ سبزہ ہے نمو سے محروم
گل نورستہ ہے بو سے محروم!
آدمی چشم ولب وگوش سے آراستہ ہیں
لطف ہنگامہ سے نور من وتو سے محروم!
مے چھلک سکتی نہیں اشک کے مانند یہاں
اور نشے کی تجلی بھی جھلک سکتی نہیں
نہ صفائے دل آئینہ میں شورش کا جمال
نہ خلائے دل آئینہ گزرگاہ خیال

آئنہ حس وخبر سے عاری
اس کے نابود کو ہم ہست بنائیں کیسے؟
آئنہ ایسا سمندر ہے جسے
کردیا دست فسوں گر نے ازل میں ساکن

عکس پر عکس در آتا ہے یہ امید لیے
اس کے دم ہی سے فسون دل تنہا ٹوٹے
یہ سکوت اجل آسا ٹوٹے

آئنہ ایک پراسرار جہاں میں اپنے
وقت کی اوس کے قطروں کی صدا سنتا ہے
عکس کو دیکھتا ہے، اور زباں بند ہے وہ
شہر مدفون کے مانند ہے وہ
اس کے نابود کو ہم ہست بنائیں کیسے؟
آئنہ حس و خبر سے عاری

◆ ◆ ◆

# تعارف

اجل، ان سے مل
کہ یہ سادہ دل
نہ اہل صلوٰۃ اور نہ اہل شراب
نہ اہل ادب اور نہ اہل حساب
نہ اہل کتاب
نہ اہل کتاب اور نہ اہل مشین
نہ اہل خلا اور نہ اہل زمین
فقط بے یقین
اجل، ان سے مت کر حجاب
اجل، ان سے مل

بڑھو، تم بھی آگے بڑھو
اجل سے ملو
بڑھو، تو تونگر گداؤ
نہ کشکول دریوزہ گردی چھپاؤ
تمہیں زندگی سے کوئی ربط باقی نہیں
اجل سے ہنسو اور اجل کو ہنساؤ
بڑھو، بندگان زمانہ بڑھو بندگان درم

اجل، یہ سب انسان متقی ہیں
متقی زیادہ ہیں، انسان کم
ہوان پر نگاہ کرم

◆ ◆ ◆

# اندھا جنگل

جس جنگل میں سورج درانہ در آیا ہے
پتھر ہے وہ جنگل، پتھر اس کے باسی بھی
دیو نے لے لی ان سے چھونے تک کی شکتی بھی
آفت دیکھی ایسی بھی؟
جن پیڑوں پر سورج نے ڈالیں اپنی کرنیں
وہ صدیوں کے اندھے پیڑ ہیں، اندھے جنگل میں
آخر آنکھیں کیسے ان کو مل جائیں پل میں
یارا ہے کس کا جل میں؟
کرنیں پھر بھی کتنی دھنی ہیں، کتنی دریا دل
چھاپ رہی ہیں مردہ پتوں ہی پر تصویریں
پوچھو، کب تصویروں سے بدلی ہیں تقدیریں؟
ہو تو ان کا دل چیریں

اس کے سوا کیونکر ٹوٹے گا گہرا سناٹا؟
قائم جس کے دم سے پیڑوں کی یہ دوری ہے
باہم تاروں کے سے فاصلے ہیں، مجبوری ہے
خواب کی سی معذوری ہے

کیونکر ان پر چلنے لگے گی وقت کی پروا پھر
بیداری ان کی رگوں میں صبحیں دوڑائے گی؟
ان کے آب وخاک سے ان کا سونا لائے گی
ان کو ہنستا پائے گی؟

◆ ◆ ◆

# زندگی اک پیرہ زن

زندگی اک پیرہ زن!
جمع کرتی ہے گلی کوچوں میں روز و شب پرانی دھجیاں
تیز، غم انگیز، دیوانہ ہنسی سے خندہ زن
بال بکھرے، دانت میلے، پیرہن
دھجیوں کا ایک سونا اور ناپیدا کراں، تاریک بن

لو ہوا کے ایک جھونکے سے اڑی ہیں ناگہاں
ہاتھ سے اس کے پرانے کاغذوں کی بالیاں
اور وہ آپے سے باہر ہو گئی
اس کی حالت اور ابتر ہو گئی
سہہ سکے گا کون یہ گھرازیاں؟

اب ہوا سے ہار تھک کر جھک گئی ہے پیرہ زن
جھک گئی ہے پاؤں پر، جیسے دفینہ ہو وہاں!
زندگی، تو اپنے ماضی کے کنوئیں میں جھانک کر کیا پائے گی؟
اس پرانے اور زہریلی ہواؤں سے بھرے، سونے کنویں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟
اس کی تہہ میں سنگریزوں کی سوا کچھ بھی نہیں
جز صدا کچھ بھی نہیں

◆◆◆

# بوئے آدم زاد

بوئے آدم زاد آئی ہے کہاں سے ناگہاں؟
دیو اس جنگل کے سناٹے میں ہیں
ہو گئے زنجیر پا خود ان کے قدموں کے نشاں!

یہ وہی جنگل ہے جس کے مرغزاروں میں سدا
چاندنی راتوں میں بے خوف و غم رقصاں رہے
آج اسی جنگل میں ان کے پاؤں شل ہیں ہاتھ سرد
ان کی آنکھیں نور سے محروم، پتھرائی ہوئی
ایک ہی جھونکے سے ان کا رنگ زرد
ایسے دیووں کے لیے بس ایک ہی جھونکا بہت
کون ہے باب نبرد؟

ایک سایہ دیکھتا ہے چھپ کے ماہ و سال کی شاخوں سے آج
دیکھتا ہے بے صدا، ژولیدہ شاخون سے انھیں
ہو گئے ہیں کیسے اس کی بو سے ابتر حال دیو
بن گئے ہیں موم کی تمثال دیو!

ہاں اتر آئے گا آدم زاد ان شاخوں سے رات
حوصلے دیووں کے مات

◆ ◆ ◆

# گداگر

جن گزرگاہوں پہ دیکھا ہے نگاہوں نے لہو
یا سیہ عورت کی آنکھوں میں یہ سہم
کیا یہ اونچے شہر رہ جائیں گے بس شہروں کا وہم
میں گداگر اور مرا دریوزہ فہم!
راہ پیمائی عصا اور عافیت کوشی گدا کا لنگ پا
آ رہی ہے ساحروں کی، شعبدہ سازوں کی صبح
تیز پا، گرداب آسا، ناچتی، بڑھتی ہوئی
اک نئے سدرہ کے نیچے اک نئے انساں کی ہو
تا بہ کے روکیں گی ہم کو چار سو؟
کیا کہیں گے اس نئے انساں سے ہم
ہم تھے کچھ انساں سے کم؟
رنگ پر کرتے تھے ہم باران سنگ
تھی ہماری ساز و گل سے نغمہ و نکہت سے جنگ
آدمی زاد کے سائے سے بھی تنگ؟

◆ ◆ ◆

# اظہار اور رسائی

موقلم، ساز، گل تازہ، تھرکتے پاؤں
بات کہنے کے بہانے ہیں بہت
آدمی کس سے مگر بات کرے؟
بات جب حیلہ تقریب ملاقات نہ ہو
اور رسائی کہ ہمیشہ سے ہے کوتاہ کمند
بات کی غایت غایات نہ ہو!

ایک ذرہ کف خاکستر کا
شرر جستہ کے مانند کبھی
کسی انجانی تمنا کی خلش سے مسرور
اپنے سینے کے دہکتے ہوئے تنور کی لو سے مجبور
ایک ذرہ کو ہمیشہ سے ہے خود سے مہجور
کبھی نیرنگ صدا بن کے جھلک اٹھتا ہے
آب و رنگ و خط و محراب کا پیوند کبھی
اور بنتا ہے معانی کا خداوند کبھی
وہ خداوند جو پابستہ آنات نہ ہو

اسی اک ذرے کی تابانی سے

کسی سوئے ہوئے رقاص کے دست و پا میں
کانپ اٹھتے ہیں مہ و سال کے نیلے گرداب
اسی اک ذرے کی حیرانی سے
شعر بن جاتے ہیں اک کوزہ گر پیر کے خواب
اسی اک ذرہ لافانی سے
خشت بے مایہ کو ملتا ہے دوام
بام و در کو وہ سحر جس کی کبھی رات نہ ہو
آدمی کس سے مگر بات کرے؟
موقلم، ساز گل تازہ، تھرکتے پاؤں
آدمی سوچتا رہ جاتا ہے
اس قدر بار کہاں، کس کے لیے، کیسے اٹھاؤں
اور پھر کس کے لیے بات کروں؟

◆◆◆

# آرزو راہبہ ہے

آرزو راہبہ ہے بے کس وتنہا وحزیں
آرزو راہبہ ہے، عمر گزاری جس نے
انہی محروم ازل راہبوں، معبد کے نگہبانوں میں
ان مہ و سال یک آہنگ کے ایوانوں میں
کیسے معبد پہ ہے تاریکی کا سایہ بھاری
روئے معبود سے ہیں خون کے دھارے جاری

راہبہ رات کو معبد سے نکل آتی ہے
جھلملاتی ہوئی اک شمع لیے
لڑکھڑاتی ہوئی، فرش و در و دیوار سے ٹکراتی ہوئی
دل میں کہتی ہے کہ اس شمع کی لو ہی شاید
دور معبد سے، بہت دور چمکتے ہوئے انوار کی تمثیل بنے
آنے والی سحر نو یہی قندیل بنے!

آرزو راہبہ ہے بے کس وتنہا وحزیں
ہاں مگر راہبوں کوئی اس کی خبر ہو کیونکر
خود میں کھوئے ہوئے، سہمے ہوئے، سرگوشی سے ڈرتے ہوئے
راہبوں کو یہ خبر ہو کیونکر

کس لیے راہبہ ہے بے کس و تنہا و حزیں
راہب استادہ ہیں مرمر کی سلوں کے مانند
بے کراں عجز کی جاں سوختہ ویرانی میں
جس میں اگتے نہیں دل سوزی انساں کے گلاب!
راہبہ شمع لیے پھرتی ہے
یہ سمجھتی ہے کہ اس سے در معبد پہ کبھی
گھاس پر اوس جھلک اٹھے گی
سنگریزوں پہ کوئی چاپ سنائی دے گی!

◆◆◆

# تمنا کے تار

تمنا کے ژولیدہ تار
گرہ در گرہ ہیں تمنا کے نادیدہ تار

ستاروں سے اترے ہیں کچھ لوگ رات
وہ کہتے ہیں ’’اپنی تمنا کے ژولیدہ تاروں کو سلجھاؤ
سلجھاؤ اپنی تمنا کے ژولیدہ تار
ستاروں کی کرنوں کے مانند سلجھاؤ
مبادہ ستاروں سے برسیں وہ تیر
کہ رہ جائے باقی تمنا نہ تار‘‘
تمنا کے ژولیدہ تار
ستاروں سے اترے ہوئے راہگیر
کہ ہے نور ہی نور جن کا خمیر
تمنا سے واقف نہیں نہ ان پر عیاں
تمنا کے تاروں کی ژولیدگی ہی کا راز
تمنا ہمارے جہاں کی، جہان فنا کی متاع عزیز
مگر یہ ستاروں سے اترے ہوئے لوگ
سررشتہ ناگزیر ابد میں اسیر

ہم ان سے یہ کہتے ہیں اے اہل مریخ
(جانے وہ کن کن ستاروں سے ہیں!)
ادب سے خوشامد سے کہتے ہیں: ''اے محترم اہل مریخ
کیا تم نہیں دیکھتے ان تمنا کے ژولیدہ تاروں کے رنگ؟''
مگر ان کو شاید کہ رنگوں سے رغبت نہیں
کہ رنگوں کی ان کو فراست نہیں!
ہے رنگوں کے بارے میں انکا خیال اور
ان کا فراق و وصال اور
ان کے مہ وسال اور

بڑی سادگی سے یہ کہتے ہیں ہم:
''محترم اہل مریخ دیکھتے نہیں
کبھی تم نے ژولیدہ باہوں کے رنگ؟
محبت میں سرخوش نگاہوں کے رنگ؟
گناہوں کے رنگ؟

◆ ◆ ◆

# زندگی سے ڈرتے ہو؟

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!
آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے
''ان کہی'' سے ڈرتے ہو
جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو
اس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو

پہلے بھی تو گزرے ہیں
دور نارسائی کے ''بے ریا'' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزومندی
یہ شب زباں بندی، ہے رہ خداوندی
تم مگر یہ کیا جانو

لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشان بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟ روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں
روشنی سے ڈرتے ہو!
شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدہام انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟

◆ ◆ ◆

# ہم کہ عشاق نہیں

ہم کہ عشاق نہیں، اور کبھی تھے بھی نہیں
ہم تو عشاق کے سائے بھی نہیں!
عشق اک ترجمہ ابوالہوسی ہے گویا
عشق اپنی ہی کمی ہے گویا!
اور اس ترجمے میں ذکرِ زر و سیم تو ہے
اپنے لمحاتِ گریزاں کا غمِ وہم تو ہے
لیکن اس لمس کی لہروں کا کوئی ذکر نہیں
جس سے بول اٹھتے ہیں سوئے ہوئے الہام کے لب
جس سے جی اٹھتے ہیں ایام کے لب
ہم وہ کمسن ہیں کہ بسم اللہ ہوئی ہو جن کی
محوِ حیرت کہ پکار اٹھے ہیں کس طرح حروف
کیسے کاغذ کی لکیروں میں صدا دوڑ گئی
اور صداؤں نے معانی کے خزینے کھولے!
یہ خبر ہم کو نہیں ہے لیکن
کہ معانی نے کئی اور بھی در باز کیے
خود سے انساں کے تکلم کے قرینے کھولے!
خود کلامی کے یہ چشمے تو کسی وادیِ فرحاں میں نہ تھے
جو ہماری ازلی تشنہ لبی نے کھولے!

ہم سرچشمہ نگوں سار کسی سوچ میں ہیں
سحر و شام ہے ہر لہر کی جمع و تفریق
جیسے اک وہم ہو اعداد کے کم ہونے کا
جیسے پنہاں ہو کہیں سینے میں غم ہونے کا!
پارہ ناں کی تمنا کہ درو بام کے سائے کا کرم
خلوت وصل کہ بزم مئے کا نغمہ کا سرور
صورت و شعر کی توفیق کہ ذوق تخلیق
ان سے قائم تھا ہمیشہ سے بھرم ہونے کا
اب درو بام کے سائے کا کرم بھی تو نہیں
آج ہونے کا بھرم بھی تو نہیں

آج کا دن بھی گزارا ہم نے اور ہر دن کی طرح
ہر سحر آتی ہے البتہ روشن لے کر
شام ڈھل جاتی ہے ظلمت گر لیکن کی طرح
ہر سحر آتی ہے امید کے مخزن لے کر
اور دن جاتا ہے نادار، کسی شہر کے محسن کی طرح
چار سو دائرے ہیں، دائرے ہیں، دائرے ہیں
حلقہ در حلقہ ہیں گفتار میں ہم
رقص و رفتار میں ہم
نغمہ و صورت و اشعار میں ہم
کھو گئے جستجوئے گیسو خم دار میں ہم

عشق نارستہ کے ادبار میں ہم
دور سے ہم کبھی منزل کی جھلک دیکھتے ہیں
اور کبھی تیز ترک بڑھتے ہیں
تو بہت دور نہیں، اپنے ہی دنبال تلک بڑھتے ہین
کھو گئے جیسے خم جادہ پرکار میں ہم

آپ تک اپنی رسائی تھی کبھی
آپ بھٹکے ہوئے راہی کا چراغ
آپ آئندہ پہنا کا سراغ
آپ ٹوٹے ہوئے ہاتھوں کی وہ گویائی تھی
جس سے شیریں کوئی آواز سرتاک نہیں
آج اس آپ کی للکار کہاں سے لائیں؟
اب وہ دانندہ اسرار کہاں سے لائیں؟

آج وہ آپ سیہ پوش اداکارہ ہے
ہے فقط سینے پہ لٹکائے سمن اور گلاب
مرگ ناگاہ سرعام سے اس کی ہیں شناسا ہم بھی
اعتراف اس کا مگر اس لیے ہم کرتے نہیں
کہ کہیں وقت پہ ہم رو نہ سکیں!
آؤ صحراؤں کے وحشی بن جائیں
کہ ہمیں رقص برہنہ سے کوئی باک نہیں!

آگ سلگائیں اسی جوب کے انبار میں ہم
جس میں ہیں بکھرے ہوئے ماضی نمناک کے برگ
آگ سلگائیں زمستاں کی شب تار میں ہم
کچھ تو کم ہو یہ تمناؤں کی تنہائی مرگ
آگ کے لمحہ آزادی کی لذت کا سماں
اس سے بڑھ کر کوئی ہنگام طربناک نہیں
کیسے اس دشت کے سوکھے ہوئے اشجار جھلک اٹھے ہیں
کیسے رہگیروں کے مٹتے ہوئے آثار جھلک اٹھے ہیں
کیسے یکبار جھلک اٹھے ہیں

ہاں مگر رقص برہنہ کے لیے نغمہ کہاں سے لائیں؟
دہل و تار کہاں سے لائیں؟
چنگ و تلوار کہاں سے لائیں؟
جب زباں سوکھ کے اک غار سے آویختہ ہے
ذات اک ایسا بیاباں ہے جہاں
نغمہ جاں کی صداریت میں آمیختہ ہے

ڈھل گئے کیسے مگر دست حنابند عروس
اجنبی شہر میں دھو آئے انھیں
لوگ حیرت سے پکار اٹھے ‘‘یہ کیا لائے تم؟’’
وہی جو دولت نایاب تھی کھو آئے تم؟’’’’

ہم ہنسے، ہم نے کہا ''دیوانو!
زینتیں اب بھی ہیں دیکھو تو سلامت اس کی
کیا یہ کم ہے سربازار یہ عریاں نہ ہوئی؟
لوگ بپھرے تو بہت، اس کے سوا کہہ نہ سکے
''ہاں یہ سچ ہے سربازار یہ عریاں نہ ہوئی
یہی کیا کم ہے کہ محفوظ ہے عفت اس کی
یہی کیا کم ہے کہ اتنا دم ہے''

ہاں تعفن، ہو کہ رقت ہو کہ نفرت ہو کہ رحم
محو کرتے ہی چلے جاتے ہیں اک دوسرے کو ہرزہ سراؤں کی طرح
درمیاں کیف و کم جسم کے ہم جھولتے ہیں
اور جذبات کی جنت میں در آ سکتے نہیں
ہاں وہ جذبات جو باہم کبھی مہجور نہ ہوں
رہیں پیوست جو عشاق کی باہوں کی طرح
ایسے جذبات طرحدار کہاں سے لائیں؟

ہم کہ احساس سے خائف ہیں، سمجھتے ہیں مگر
ان کا اظہار شب عہد نہ بن جائے کہیں
جس کے ایفا کی تمنا کی سحر ہو نہ سکے
روبرو فاصلہ در فاصلہ ہے
س طرف پستی دل برف کے مانند گراں

اس طرف گرم صلا حوصلہ ہے
دل بدریا زدن اک سو ہے تو اک سو کیا ہے؟
ایک گرداب کہ ڈوبیں تو کسی کو بھی خبر ہو نہ سکے!
اپنی ہی ذات کی سب مسخرگی ہے گویا؟
اپنے ہونے کی نفی ہے گویا؟

نہیں، فطرت کہ ہمیشہ سے وہ معشوق تماشا جو ہے
جس کے لب پر ہے صدا: تو جو نہیں، اور سہی
اور سہی، اور سہی
کتنے عشاق سر راہ پڑے ہیں گویا
شب یک گانہ و سہ گانہ و نہ گانہ کے بعد
(اپنی ہر ''سعی'' کو جو حاصل جاوید سمجھتے تھے کبھی!)
ان کے لب پہ نہ تبسم نہ فغاں ہے باقی
ان کی آنکھوں میں فقط سر نہاں ہے باقی
ہم کہ عشق نہیں اور کبھی تھے بھی نہیں
ہمیں کھا جائیں نہ خود اپنے ہی سینوں کے سراب
لیتنی کنت تراب!
کچھ تو نذرانہ جاں ہم بھی لائیں
اپنے ہونے کا نشاں ہم بھی لائیں!

◆ ◆ ◆

# اے غزال شب

اے غزال شب
تری پیاس کیسے بجھاؤں میں
کہ دکھاؤں میں وہ سراب جو مری جاں میں ہے؟
وہ سراب ساحر خوف ہے
جو سحر سے شام کے رہگزر
میں فریب رہرو سادہ ہے
وہ سراب زادہ، سراب گر، کہ ہزار صورت نو بنو
میں قدم قدم پہ ستادہ ہے
وہ جو غالب و ہمہ گیر دشت گماں میں ہے
مری دل میں جیسے یقین بن کے سما گیا
مرے ہست و بود پہ چھا گیا!

اے غزال شب
اسی فتنہ کار سے چھپ گئے
مرے دیروزود بھی خواب میں
مرے نزدودور حجاب میں
وہ حجاب کیسے اٹھاؤں میں جو کشیدہ قالب دل میں ہے
کہ میں دیکھ پاؤں درون جاں

جہاں خوف وغم کا نشاں نہیں
جہاں یہ سراب رواں نہیں
اے غزالِ شب!

◆◆◆

# آنکھیں کالے غم کی

اندھیرے میں یوں چمکیں آنکھیں کالے غم کی
جیسے وہ آیا ہو بھیس بدل کر آمر کا
آنے والے جابر کا
سب کے کانوں میں بن ڈالے مکڑی نے جالے
سب کے ہونٹوں پر تالے
سب کے دلوں میں بھالے!
اندھیرے میں یوں چمکے میلے دانت بھی غم کے
جیسے پچھلے دروازے سے آمر آدھمکے
سر پر ابن آدم کے
غم بھی آمر کے مانند اک دم والا تارا
یا جلتا بجھتا شرارا
جو رستے میں آیا سو مارا!

غم گرجا برسا، جیسے آمر گرجے برسے
خلقت سبھی دیکھی تھی اک مبہم سے ڈر سے
خلقت نکلی پھر گھر سے
بستی والے بول اٹھے ”اے مالک! اے باری
کب تک ہم پہ رہے گا غم کا سایہ یوں بھاری
کب ہوگا فرماں جاری؟“

◆ ◆ ◆

# وہ حرف تنہا

ہمارے اعضاء جو آسماں کی طرف دعا کے لیے اٹھے ہیں
(تم آسماں کی طرف نہ دیکھو!)
مقام نازک پہ ضرب کاری سے جاں بچانے کا ہے وسیلہ
کہ اپنی محرومیوں سے چھپنے کا ایک حیلہ؟
بزرگ و برتر خدا بھی تو (بہشت برحق)
ہمیں خدا سے نجات دے گا
کہ ہم ہیں اس سرزمیں پہ جیسے وہ حرف تنہا
(مگر وہ ایسا جہاں نہ ہوگا) خموش و گویا
جو آرزوئے وصال معنی میں جی رہا ہو
جو حروف معنی کی یک دلی کو ترس گیا ہو

ہمیں معری کے خواب دے دو
(کہ سب کو بخشیں بقدر ذوق نگہ تبسم)
ہمیں معری کی روح کا اضطراب دے دو
(جہاں گناہوں کے حوصلے سے ملے تقدس کے دکھ کا مرہم)
کہ اس کی بے نور و تار آنکھیں
(درون آدم کی تیرہ راتوں
کو چھیدتی تھیں

اسی جہاں میں فراق جاں کا وہ حرف و معنی کو دیکھتی تھیں
بہشت اس کے لیے وہ معصوم سادہ لوحوں کی عافیت تھا
جہاں وہ ننگے بدن پہ جابر کے تازیانوں سے بچ کے راہ فرار پائیں
وہ کفش پا تھا، کہ جس سے غربت کی ریگ بریاں سے روز فرصت قرار پائیں
کہ صلب آدم کی، رحم ہوا کی عزلتوں میں نہایت انتظار پائیں
(بہشت صفر عظیم، لیکن ہمیں وہ گم گشتہ ہندسے ہیں
بغیر جن کے کوئی مساوات کیا بنے گی
وصال معنی سے حرف کی بات کیا بنے گی؟)
ہم اس زمین پر ازل سے پیرانہ سر ہیں، مانا
مگر ابھی تک ہیں دل توانا
اور اپنی ژولیدہ کاریوں کے طفل دانا
ہمیں معری کے خواب دے دو
(بہشت میں بھی نشاط، یک رنگ ہو تو، غم ہے
کہ ہم ابھی تک ہیں اس جہاں میں وہ حرف تنہا
(بہشت رکھ لو، ہمیں خود اپنا جواب دے دو!)
جسے تمنا وصل معنا

◆ ◆ ◆

# بے پروبال

جب کسی سلطنت گم شدہ کے خواب
کبھی اشک، کبھی قہقہہ بن کر دل رہرو کو لبھاتے جائیں
(نیم شب کون ہے آوارہ دعاؤں کی طرح
لو چلے آتے ہیں وہ عقدہ کشاؤں کی طرح)
اور وہ راہرو سادہ کسی اشک، کسی قہقہے کی تہہ میں
سینہ خاک نشینوں کی نوا سن نہ سکے
ہم ہیں وہ جن پہ نظر ڈالی ہے سلطانوں نے
ہیں کہاں اور گدا ہم سے گداؤں کی طرح؟)
جن سے ہیں آج بھی گلیوں کے شبستاں روشن
کسی جبار کے کوڑوں کی صدا سن نہ سکے
(بندگی کام ہے اور بندہ دولت ہم ہیں
منہ پہ اوڑھے ہوئے دستور کا تہ دامن
(تو خداوند ہے کرام خداؤں کی طرح)
اور اجڑے ہوئے سینوں کا خلا سن نہ سکے
سنسناتے ہوئے امارتوں کے جن مین
(شب تنہائی در و بام ڈراتے ہیں مجھے
دل میں اندیشے اترتے ہیں بلاؤں کی طرح
ہم سے کیوں خانہ خرابی کا سبب پوچھتے ہو

کس نے اس دور میں ڈالی ہے جفاؤں کی طرح!
گو زمانے کا ہر اک نقش، ہر اک چیز سر رہگزر باد سہی
یاد اک وہم سہی، یاد تمناؤں کی فریاد سہی
سر سے ڈھل جائے کہیں راحت رفتہ کا خمار
شام دارائی کا آسودہ غبار؟
جب کسی سلطنت گم شدہ کے خواب
کبھی اشک، کبھی قہقہہ بن کر دل رہرو کو لبھاتے جائیں
وہ کبھی سرخی دامن میں
کبھی شوق سلاسل میں
کبھی عشق کی للکار میں لوٹ آتے ہیں
بے پروبالی انساں کی شب تار میں لوٹ آتے ہیں
جی کے آزار میں لوٹ آتے ہیں.

◆ ◆ ◆

# ہمہ تن نشاط وصال ہم

ہمیں یاد ہے وہ درخت جس سے چلے ہیں ہم
کہ اسی کی سمت (ازل کی کوری چشم سے)
کئی بار لوٹ گئے ہیں ہم
(میں وہ حافظہ جسے یاد مبدا و منتہا جسے یاد منزل و آشیاں)
اسی اک درخت کے آشیاں میں رہے ہیں ہم
اسی آشیاں کی تلاش میں
ہیں تمام شوق، تمام ہو اسی ایک وعدہ شب کی سو
ہیں تمام کاوش آرزو
یہ خلائے وقت کہ جس میں ایک سوال ہم
کوئی چیز ہم، نہ مثال ہم
جسے نوک خار سے چھید دیں
وہی ایک نقطہ خال ہم
(میں وہ حادثہ جو ہزار حادثوں کی طرح
ہوا سیر حلقہ دام جاں
جو اسیر ہو، مگر اور ایسے ہی حادثوں کی طرح ہمیشہ رواں دواں
اسی ایک وعدہ شب کی سو!
مری ایک جنبش چشم تک
کئی حادثات کا سلسلہ

نہیں جن میں لمحے کا فاصلہ
ہوں اسیر جس میں یہ حادثے، میں وہ حافظہ )
ہمہ تن نشاط وصال ہم
مگر آشیاں کے بغیر وہم و خیال ہم
ہیں رواں کہ مل کے زباں بنیں
کوئی داستاں، کوئی نغمہ، کوئی بیاں بنیں
ہے مگر یہ خطرہ پے بہ پے کہ یہ جستجوئے عظیم بھی
نہ کہیں ہو راز تلاش منزل جستجو،
کہ یہ جانتے ہیں نہیں ہیں اپنا مال ہم
کبھی موقلم، کبھی پردہ ہم،
کبھی خط ہیں اور کبھی خال ہم
نہیں نقش گر، نہیں نقش گر کا کمال ہم!

◆◆◆

# گرد باد

غم کے دنداتے بہت
گرد باد اک موج پراں، گرد باد اک ہمہمہ،
گرد باد اک سایہ ہے،
گرد باد غم کے دندانے بہت!
اس کی اک آواز اک پھنکار ویرانے بہت
اس کی آوازوں میں بام و در بھی گم
اس کی پھنکاروں میں خیر و شر بھی گم
ریگ بے مہری سے پر سینوں کے پیمانے بہت
شہر تنہا اور برہنہ شہر
جن کا کام جاری تھا ابھی،
جن کی صبحوں میں اذاں کا نام جاری تھا ابھی،
(ایک ہی صبح اذاں، صبح اجل!)
جن کی جولانی کا دور جام جاری تھا ابھی،
ہاں انہی کی شاہراہوں کا ضمیر
بے صدائی میں اسیر
ہانپتا پھرتا ہے خوں آلود دہلیزوں کے پاس
اس کی دلجوئی کو درد دل کے کاشانے بہت
اور تمناؤں کے واماندہ شجر

حیرت آسا خامشی میں تن دہی سے اشک ریز
گرد باد غم کے نقش پا کہاں
اس کا پائے لنگ ہو اس کا سہارا تا کجے؟
اس کو ویرانی کا یارا تا کجے؟
اس کے افسانے بہت

◆ ◆ ◆

# افسانۂ شہر

شہر کے شہر کا افسانۂ وہ خوش فہم مگر سادہ مسافر
کہ جنھیں عشق کی للکار کے رہزن نے کہا ’’آؤ!
دکھلائیں تمھیں ایک دربستہ کے اسرار کا خواب‘‘
شہر کے شہر کا افسانۂ وہ دل جن کے بیاباں میں
کسی قطرۂ گم گشتہ کے ناگاہ لرزنے کی صدا نے یہ کہا
’’آؤ دکھلائیں تمھیں صبح کے ہونٹوں پہ تبسم کا سراب

شہر کے شہر کا افسانۂ وہی آرزوئے خستہ کے لنگڑاتے ہوئے پیر
کہ ہیں آج بھی افسانے کی دزدیدہ و ژولیدہ لکیروں پہ رواں
ان اسیروں کی طرح جن کے رگ و ریشہ کی زنجیر کی جھنکار
بھی تھم جائے تو کہہ اٹھیں کہاں
’’اب کہاں جائیں گے ہم
جائیں اب تازہ و نادیدہ نگاہوں کے زمستاں میں کہاں؟
ان اسیروں کی طرح جن کے لیے وقت کی بے صرفہ سلاخیں
نہ کبھی سرد نہ گرم، اور نہ کبھی سخت نہ نرم
نہ رہائی کی پذیرائی نہ اسیری ہی کی شرم

شہر کے شہر کا افسانۂ وہ روحیں جو سریل کے سوا

اور کہیں وصل کی جویا ہی نہیں
پل سے جنھیں پار اترنے کی تمنا ہی نہیں
اس کا یارا ہی نہیں

◆ ◆ ◆

# میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو

میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو
نارسا ہاتھ کی نمنا کی ہے
ایک ہی چیخ ہے فرقت کے بیابانوں میں
ایک ہی طول المنا کی ہے
ایک ہی روح جو بے حال ہے زندانوں میں
ایک ہی قید تمنا کی ہے

عہد رفتہ کے بہت خواب تمنا میں ہیں
اور کچھ واہمے آئندہ کے
پھر بھی اندیشہ وہ آئینہ ہے جس میں گویا
میر ہو، مرزا ہو، میرا جی ہو
کچھ نہیں دیکھتے ہو
محو عشق کی خودمست حقیقت کے سوا
اپنے ہی بیم و رجا اپنی ہی صورت کے سوا
اپنے رنگ، اپنے بدن، اپنے ہی قامت کے سوا
اپنی تنہائی جانکاہ کی وحشت کے سوا
''دل خراشی وجگر چاکی وخوں افشانی
ہوں تو ناکام پہ ہوتے ہیں مجھے کام بہت''

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئنہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے“
”رات کے پچھلے اندھیرے میں کوئی سایہ نہ تھا
چاند کے آنے پہ سائے آئے
سائے ملتے ہوئے، گھلتے ہوئے کچھ بھوت سے بن جاتے ہیں“
(میر ہو مرزا ہو، میرا جی ہو
اپنی ہی ذات کی غربال میں چھن جاتے ہیں!)
دل خراشیدہ ہو خوں دادہ رہے
آئنہ خانے کے ریزوں پہ ہم استادہ رہے
چاند کے آنے پہ سائے بہت آئے بھی
ہم بہت سایوں سے گھبرائے بھی
میر ہو، مرزا ہو میرا جی ہو
آج جاں اک نئے ہنگامے میں در آئی ہے
یاد وہ عشرت خوناب کسے؟
فرصت خواب کسے؟

◆ ◆ ◆

# مسکراہٹیں

مسکراہٹیں ہیں وہ کرم کہ جس کا ریشہ
استوار ازل میں ہے
ابد بھی جس کے ایک ایک پل ہی میں ہے
کبھی ہیں سہو گفتگو
کبھی اشارہ خرد، کبھی شرارہ جنوں
کبھی ہیں راز اندروں
وہ مسکراہٹیں بھی ہیں کہ پارہ ہائے ناں بنیں
وہ مسکراہٹیں بھی ہیں کہ برگ زرفشاں بنیں
کبود رنگ، زرد رنگ، نیلگوں
کبھی ہیں پیشہ ور کا التہاب خوں
کبھی ہیں رس، کبھی ہیں مے
کبھی ہیں کارگر کا رنگ نے
کبھی ہیں سنگ رہ
کبھی ہیں راہ کا نشاں
کبھی ہیں پشت پا پہ چور بن کے گامزن
کبھی فریب جستجو
کبھی یہی فراق لب، کبھی یہی وصال جاں
مگر ہمیشہ سے وہی کرم
کہ جس کا ریشہ استوار ازل میں ہے

◆ ◆ ◆

# زمانہ خدا ہے

’’زمانہ خدا ہے‘ اسے تم برا مت کہو‘‘
مگر تم نہیں دیکھتے زمانہ فقط ریسمانِ خیال
سبک مایہ‘ نازک‘ طویل
جدائی کی ارزاں سبیل
وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں؛
وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی‘
انھیں تم نہیں دیکھتے‘ دیکھ سکتے نہیں
کہ موجود ہیں‘ اب بھی‘ موجود ہیں وہ کہیں
مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسی تنی ہے
اسے دیکھ سکتے ہو‘ اور دیکھتے ہو
کہ یہ وہ عدم ہے
جسے ہست ہونے میں مدت لگے گی
ستاروں کے لمحے‘ ستاروں کے سال!

مرے صحن میں ایک کمسن بنفشے کا پودا ہے
طیارہ کوئی کبھی اس کے سر پر سے گزرے
تو وہ مسکراتا ہے اور لہلہاتا ہے
گویا وہ طیارہ‘ اس کی محبت میں

عہد وفا کے کسی جبر طاقت ربا ہی سے گزرا!
وہ خوش اعتمادی سے کہتا ہے:
''لو دیکھو کیسے اسی ایک رسی کے دونوں کناروں
سے ہم تم بندھے ہیں!
یہ رسی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں
ہو پیدا یہ راہِ وصال؟''
مگر ہجر کے ان وسیلوں کو وہ دیکھ سکتا نہیں
جو سرا سر ازل سے ابد تک تنے ہیں
جہاں یہ زمانہ ہنوز زمانہ
فقط اک گرہ ہے!

◆◆◆

# بے مہری کی تابستانوں میں

بے مہریٔ بے گانہ پن کے تابستانوں میں
ہر سو منڈلانے لگتی ہیں زنبور اوہام
اور ساتھ اپنے اک ابدیت لاتے ہیں
شہروں پر خلوت کی شب چھا جاتی ہے
غم کی صرصر تھراتی ہے ویرانی میں
اونچے طاقتور پیڑوں کے گرنے کی آوازیں آتی ہیں میدانوں میں
بے مہریٔ بے گانہ پن کے تابستانوں میں
جس دم منڈلانے لگتے ہیں زنبور اوہام
جب ہم اپنی روحوں کو
لا ڈالتے ہیں یوں غیریت کے دوراہوں میں
روحیں رہ جاتی ہیں جسموں کے نم دیدہ پیراہن
یا جسموں کے بوسیدہ اترن
ہر بے مہری کے ہنگام
کیا یہ کہنا جھوٹ تھا' اے جاں
انساں سب سے بیش بہا ہے
کیوں اس کی رسوائی ہو
بے بصری کے بازاروں کے بے مایہ دکانوں میں؟
کیا یہ کہنا جھوٹ تھا' اے جاں!

ہم سب فرد ہیں، ہم پر اپنی ذات سے بڑھ کر
کس آمر کی دارائی ہو؟
کیا یہ کہنا جھوٹا تھا، اے جاں
ہم سب ہست ہیں، ہم کیوں جاں دیں
مذہب اور سیاست کے نابودوں پر؟
موہوموں کو فوقیت دیں
آگاہی کی آنکھوں سے، وجودوں پر؟
بے مہری کے زنبور گئے تو
ذہن اوہام باطن کی
شوریدہ فصیلوں سے نکلے
غم کے آسیب ایذا کے
نادیدہ وسیلوں سے نکلے
پھر ہم لحن آب و زمیں کی
قندیلوں سے سرشار ہوئے
ہم نے دیکھا، ہم تم گویا تاک سے پر ہیں
ہم تم اس خورشید سے پر ہیں
آہنگ حرف و معنی کے
ذرے جس کے دامن میں
ہم تم شیوہ باراں سے پر ہیں
آہنگ حرف و معنی کے
نغمے جس کے دامن میں

ہم دریا سے پرے ہیں
ہم ساحل سے پرے ہیں
ہم موجوں سے پرے ہیں
ہم ایک بشارت سے پرے ہیں

◆◆◆

# مری مور جاں

مری مور جاں،
مور کم مایہ جاں،
رات بھر زیر دیوار ز دیوار کے پاؤں میں
رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی تھی؟
مگر صبح ہونے سے پہلے
انھوں نے جو دروازہ کھولا
تو میں مردہ پایا گیا
(مرے خواب زندہ بچے تھے!)
مجھے آنسوؤں کے کرم سے ہمیشہ عداوت رہی ہے
تو میں نے یہ پوچھا عزیزو!
تمھیں اس کا خدشہ نہیں
کہ میرے زیاں سے، وہ آہنگ حرف و معانی
نمودار ہوگا، مری مور جاں جس کی خاطر
سدا رینگتی، سانپ لہریں بناتی رہی ہے؟
تمھیں اس کا خدشہ نہیں،
کہ یہ خواب بھی،
جو مری موت پہ تہ نشین رہ گئے ہیں،
جنھیں تم ہزاروں برس تک
چھپاتے پھروگے اساطیر کے روزنوں میں

محبت کے کافور کو چیر کر
عقیدت کی روئی کے تودوں سے ناگہ نکل کر
عجائب گھروں میں، ہزاروں برس بعد کے
زائروں کے لیے راحت جاں بنیں گے،
تمھیں اس کا خدشہ نہیں ہے؟''
لگے جیسے یہ بات میں نے
انھی کے دلوں سے چرالی!
وہ کہنے لگے ہاں یہ خدشہ تو ہے
آؤ، اس مرنے والے کو پھر سے جلادیں
(مگر اس کے خوابوں سے نابود کردیں)
اسے رینگنے دیں
اسے سالہا سال تک رینگنے دیں
کہ اس کی نگاہوں میں پھر خواب پیدا نہ ہوں
اسے رینگنے دیں
اسے سالہا سال تک رینگنے دیں
اور آئندہ نسلوں کی جانیں
غم آگہی سے بچالیں!

# بے صدا صبح پلٹ آئی ہے

بے صدا صبح پلٹ آئی ہے،
ہیں ابھی رہگزر خواب میں اندیشے
گداؤں کی قطار
سرنگوں، خیرہ نگاہ، تیرگلیم
گزرے لمحات کا انبار لگائے
شب کی دریوزہ گری کا حاصل!

بے صدا صبح پلٹ آئی ہے
ریزش آب سر برگ سنائی دی ہے
اور درختوں پہ ہے رنگوں کی پکار
کتنے زنبور مرے کمرے میں در آئے ہیں
نوش جاں بزم سحر گاہ کی ہو
ایک ہنگامہ پلٹ آیا ہے
(خواب کا چہرہ زیبا بھی لوٹ آئے گا
لب خنداں بھی پلٹ آئیں گے)
عشق ہو، کام ہو، یا وقت ہو یا رنگ ہو
خود اپنے تعاقب میں رواں
اپنی ہی پہنائی تک

کیسے اک دائرہ بن جاتا ہے
تاک کی شاخ سے تا لرزش مے
لرزش مے سے تمناؤں کی رعنائی تک
اور تمناؤں کی گلزاری سے
صبح انگور کی دارائی تک
کیسے اک دائرہ بن جاتا ہے
بے صدا صبح پلٹ آئی ہے
پاؤں کی چاپ لباسوں کی صریر
اور بڑھتی ہوئی کوچوں کی نفیر
نوش جاں: کام کا ہنگامہ
یہی عشق بھی ہے چہرۂ زیبا بھی یہی
یہی پھولوں کا پر و بال بھی ہے
رنگ لب ہائے مہ و سال بھی ہے!

◆◆◆

# تسلسل کے صحرا میں

تسلسل کے صحرا میں ریگ وہوا پاؤں کی چاپ
سمت وصدا
تعبیر کا تنہا نشاں
تسلسل کے صحرائے جان سوختہ میں
صدائیں بدلتے مہ وسال
ہوائیں گزرتے خدوخال
تنہا نشان فراق ووصال

تسلسل کے صحرا میں
اک ریت ٹیلے کی آہستہ آہستہ ریزش
کسی گھاس کے نامکمل جزیرے میں اک جاں بلب
طائرشب کی لرزش
کسی راہ بھٹکے عرب کی سحرگاہ حمدوثنا
تسلسل کے بے اعتنا رات دن میں تغیر کا
تنہا نشان محبت کا تنہا نشاں
صبا ہو کہ صرصر کہ بادنسیم
درختوں کی ژولیدہ زلفوں میں بازی کناں
اور ذروں کے تپتے ہوئے سرخ ہونٹوں سے بوسہ ربا

جب گزرتی ہے، بیدار ہوتے ہیں اس کی صدا
سے بدلتے ہوئے حادثوں کے نئے سلسلے
نئے حادثے جن کے دم سے تسلسل کا رویا تھیں
نئے حادثے جن کے لطف و کرم کی نہایت نہیں
تسلسل کے صحرا میں میرا گزر کل ہوا
تو یادیں نگاہوں کے آگے گزرتے ہوئے رہگزر
بن گئیں
پہاڑوں پہ پانی کے باریک دھارے
فرازوں سے اترے، بہت دور تک دشت و در
میں مچلتے رہے، پھر سمندر کی جانب بڑھے
اور طوفاں بنے،
ان کی تاریک راتیں سحر بن گئیں
ازل کے درختوں میں سیبوں کے رسیا
ہمارے جہاں دیدہ آبا
درختوں سے اترے، بہت دور تک دشت و در
میں بھٹکتے رہے پھر وہ شہروں کی جانب بڑھے
اور انساں بنے، ہر طرف نور باراں بنے
وہ سمت و صدا جو سفر
کا نشاں تھیں
وہی منتہائے سفر بن گئیں!
تسلسل کے صحرا میں ریگ و ہوا، پاؤں کی چاپ

سمت و صدا

تسلسل کا راز نہاں، تغیر کا تنہا نشاں

محبت کا تنہا نشاں

◆◆◆

# دیوار

کتنی آوارہ و سرگشتہ ہو
لوٹ آتی ہے دیوار سے ٹکرا کے نگاہ
دیکھ پتوں کی کئی نسلوں کے انبار کہ ہیں
ایک انبوہ پریشاں خم دیوار کے ساتھ
دیکھ انگور کی ان سوکھی ہوئی بیلوں کی گیرائی بھی
کس طرح صحن میں ایک ان میں سے جھک آئی بھی

توڑ کے فرش کو ہمسائے نے دیوار لگائی تھی کبھی
(ایک پردہ بھی ہے، سایہ بھی ہے، دارائی بھی
اس سے ملتی نہیں عشق تنک مایہ کو راہ
کام آتی نہیں مہتاب کی بینائی بھی)
اور دیوار پہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کی قطار
نیلگوں، سرخ، طلا رنگ، سیاہ
کس عرق ریزی سے، ہمت سے سجائی تھی کبھی
کہیں چھونے کی جسارت نہ کریں چور کے ہاتھ
(حیف شیشوں پہ لپٹ آئی ہے اب کائی بھی)
بوڑھے ہمسائے سے ہم کیوں نہ کہیں
کوئی مطلب نہیں انوار سے رنگوں سے صداؤں سے تجھے؟

راحت جاں سے شرابور ہواؤں سے غرض؟
صبح کے نغمہ سراؤں سے غرض؟
تجھے بھاتی نہیں خوشبوؤں کی رعنائی بھی؟

بوڑھا ہمسایہ نے گا لیکن؟
زیر دیوار جو کرتا ہے بکھرتے ہوئے تاروں کا شمار
اپنے ٹوٹے ہوئے شیشوں کی قطاروں کا شمار
شام پیری کے اشاروں کا شمار؟

◆◆◆

# پیرو

تو مرے پیچھے، مری قدموں پہ میلوں تک چلا
مجھ کو تیرے ہانپتے پاؤں کی دزدیدہ صدا آتی رہی
ایک مجبورِ ازل دل کی نوا آتی رہی
تو نے دوراہوں پہ آ کر لوٹ جانے کا ارادہ بھی کیا
ترک جادہ بھی کیا
پھر بھی تو چلتا رہا چلتا رہا
میں تذبذب پر ترے ہنستا رہا ہنستا رہا!
تو مرا سایہ ہے لیکن
تجھ کو سایہ بن کے رہنا ناگوار
ثانوی نسبت کا سہنا ناگوار
تو کبھی قامت، کبھی جثے کی افزائش
کی سعی رائیگاں کرتا رہا
راہگیروں سے یہ دردِ دل بیاں کرتا رہا

مجھ کو یہ ڈر تو نہیں
ایک دن تو مجھ کو آ لے گا کہیں
سوچتا ہوں
تجھ سے پائے پیمائی کے سارے حوصلے

میں گماں ہوں، میں گماں ہوں
اور تو میرا یقیں
میں تری صورت ہوں شاید
اور تو معنا مرا
میں ترا پیرو ہوں تو ہے رہبر دانا مرا
سوچتا ہوں
نقل لے لوں، اصل دے ڈالوں تجھے
اپنے جسم و روح میں ''میں'' کی طرح پالوں تجھے
ہاں اگر اندیشہ ہے دل میں تو یہ
پھر بھی رہ جائیں نہ باقی وہ نجومی فاصلے
میرے تیرے درمیاں جو سالہا قائم رہے
جن کا تو شاکی رہا
تو مرے پیچھے، مرے قدموں پہ میلوں تک چلا
چلتا رہا دائم رہے چلنا ترا

◆ ◆ ◆

# وہی کشف ذات کی آرزو

مرا دل گرو، مری جاں گرو!
چلا آ کہ ہے مرا در کھلا
تو مرا نصیب ہے راہرو!
یہ ہوا، یہ برق، یہ رعد و ابر، یہ تیرگی
راہ انتظار کی نارسی
مرے جان و دل پہ ہیں تو بتو
مرے میہماں، مرے راہرو
اے گریز پا، تو سراب دشت خلا نہ بن
وہ نوا نہ بن جو فریب راہگزار ہو
وہ فسون ارض و سما نہ بن
جسے دل گرفتوں سے عار ہو
جو تجھے بلاتی ہے پے بہ پے
وہ صدا جلاجل جاں کی ہے
وہ صدا مرور زماں کی ہے!
کسے اس صدا سے فرار ہو؟
مرا دل گرو، مری جاں گرو
تری کن مکن، تری رو مرو
مجھے بار جاں،

کہ میں حرف جس کا بیاں ہے تو
میں وہ جسم جس کی رواں ہے تو
تو کلام ہے، میں تری زباں
تو وہ شمع ہے کہ میں جس کی لو
کسی نقش کار کا اک نفس
کئی صورتیں جو سدا سے تشنۂ رنگ تھیں
ہوئیں وصل معنی سے بارور
کسی بت تراش کی اک نگہ
کئی سنگ اذیت یاس و مرگ سے بچ گئے
ہوئے سمت راہ سے باخبر!
چلا آ کہ میری ندا میں بھی
وہی روئیت ازلی کہ ہے
جسے یاد غایت رنگ و بو
جسے یاد وعدہ تار و پو!
چلا آ کہ میری ندا میں بھی
اسی کشف ذات کی آرزو

◆ ◆ ◆

# نئی تمثیل

ہم کہ سب تیرے پرستاروں میں ہیں، اے طلاموس کبیر، تو ہمارا دستگیر
(جیسے ہر کامل ہے ساکن
اس طرف کامل کہ جو ساکن بھی ہے، محدود بھی
اس طرف اک خام، خاموں کی طرح
حرکت میں ہے، غلطاں بھی ہے
ناشکیبا بھی ہے، بے پایاں بھی ہے!)
کونسی جانب بڑھیں،
اے طلاموس کبیر؟
سنگ میل ہست پر جم جائیں ہم؟
ماجرا کے سامنے آنکھیں بچھائیں؟

کھیل کھلتا ہے، تو کھلتی جارہی ہے
(کیسی کمسن!) داستاں،
ڈھلتے جاتے ہیں اشارے حرف، آوازیں، ادائیں،
خود اداکاروں کا باطن داستاں!
ان کے متحرک قدم، اور ان کے سائے
دیکھنے والوں کا غوغا: ''چپ رہو!
چپ رہو، ہم کچھ سمجھ سکتے نہیں،

مبتذل آوارہ بس مت کچھ کہو
شرمناک اب کچھ نہ گاؤ
دیکھنے والوں کا ہنگامہ کہ بام و فرش ایک
یہ نئی تمثیل جس کا تو ہی خالق
کیسا حوا، کیسا مریم کھیل
کیا تو نے اسے دیکھا نہیں
داستاں طے کی نہ تھی،
حرف تک، کوئی اشارہ تک کبھی سوچا نہ تھا؟
پھر بھی سرگرمی سے جاری ہے یہ کھیل!
اے طلاموس کبیر،
ایک نافہمی کے پتھر پر یہ کیوں خوابیدہ ہیں
ایک پیرہ زال سے چسپیدہ ہیں،
دیکھنے والوں میں کیوں اتنے ادا نا آشنا؟

"اس فسون و خواب کی تصویر آرائی کریں،
جو پیر ہے، پارینہ ہے؟
یا سبک پا روز و شب کے عشق سے
سینوں کو تابندہ کریں؟"
اے اداکارو نہیں
جیسے ہی پھر پردہ گرا
گونج بن کر ان کے ذہنوں میں دمک اٹھے گا کھیل،

(ان کی نظریں دیکھیے!)
ان کو بچوں کی محبت، گھر کی راحت،
اور زمیں کا عشق سب یاد آئے گا،
ان کے صحرا جسم و جاں میں
فہم کی شبنم سے پھر اٹھے گا
حس دریا کا شور!
خود اداکاروں سے یہ بھی کم نہیں،
یہ اداکاروں کی آوازوں پہ کچھ جھولے سہی،
لفظوں کو بھی تولا کیے، قدموں کو بھی گنتے رہے،
ان کے چہرے زرد، رخسارے اداس
درد کی تہذیب کے پیرو،
ہزاروں سال کی مبہم پرستش،
یہ مگر کیا پا سکے؟
آہ کے پیاسے، کبھی اشکوں کے مستانے رہے
اپنے بے بس عشق کو عشق رسا جانے رہے
ہر نئی تمثیل کے معنی سے بیگانے رہے!
جب اداکاروں کی رخصت کی گھڑی آئی
تو جاگیں گے، تو یاد آئے گا ہم میں
اور اداکاروں میں نافہمی کے تار
اور کوئی فاصلہ حائل نہ تھا!

اے طلاموس کبیر
تیرا پیغمبر ہوں میں!
تو نے بخشا ہے مجھے کچھ فیصلوں کا اختیار
ان اداکاروں سے ان کے دیکھنے والوں
کا عقد تو یہ میرا فیصلہ
’’تم میاں ہو، اور تم بیوی ہو
تم ملکہ ہو، تم ہو شہریار
تم بندر ہو، تم بندریا
ہم کہ سب تیرے پرستاروں میں ہیں‘‘
اے طلاموس کبیر!

◆◆◆

# سالگرہ کی رات

آج دروازے کھلے رہنے دو
یاد کی آگ دہک اٹھی ہے
شاید اس رات ہمارے شہداء آ جائیں
آج دروازہ کھلے رہنے دو
جانتے ہو کبھی تنہا نہیں ہیں شہید؟
میں نے دریا کے کنارے جو پرے دیکھے ہیں
جو چراغوں کی لویں دیکھی ہیں
وہ لویں بولتی تھیں زندہ زبانوں کی طرح
میں نے سرحد پہ وہ نغمات سنے ہیں کہ جنھیں
کون گائے گا شہیدوں کے سوا؟
میں نے ہونٹوں پہ تبسم کی نئی تیز چمک دیکھی ہے
نور جس کا تھا حلاوت سے شرابور
اذاں کی طرح!
ابھی سرحد سے میں لوٹا ہوں ابھی'
میں ابھی ہانپ رہا ہوں مجھے دم لینے دو
راز وہ ان کی نگاہوں میں نظر آیا ہے
جو ہمہ گیر تھا نادیدہ زمانوں کی طرح
یاد کی آگ دہک اٹھی ہے

سب تمناؤں کے شہروں میں دہک اٹھی ہے
آج دروازہ کھلے رہنے دو
شاید اس رات ہمارے شہدا آ جائیں
وقت کے پاؤں الجھ جاتے ہیں آواز کی زنجیروں سے
ان کی جھنکار سے خود وقت جھنک اٹھتا ہے
نغمہ مرتا ہے کبھی، نالہ بھی مرتا ہے کبھی؟
سنسناہٹ کبھی جاتی ہے محبت کے بجھے تیروں سے؟
میں نے دریا کے کنارے انھیں یوں دیکھا ہے
میں نے جس آن میں دیکھا ہے انھیں
شاید اس رات
اس شام ہی
دروازوں پہ دستک دیں گے
شہدا اتنی سبک پا ہیں کہ جب آئیں گے
نہ کسی سوئے پرندے کو خبر تک ہو گی
نہ درختوں سے کسی شاخ کے گرنے کی صدا گونجے گی
پھڑ پھڑاہٹ کی زنبور کی بھی کم ہی سنائی دے گی
آج دروازے کھلے رہنے دو!
ابھی سرحد سے میں لوٹا ہوں ابھی
پار جو گزرے گی اس کا ہمیں غم ہی کیوں ہو؟
پار کیا گزرے گی، معلوم نہیں
ایک شب جس میں

پریشانی آلام سے روحوں پہ گرانی طاری
روحیں سنسان، یتیم
ان پہ ہمیشہ کی جفائیں بھاری
بوئے کافور اگر بستے گھروں سے جاری
بے پناہ خوف میں رویائے شکستہ کی فغاں اٹھے گی
بجھتی شمعوں کا دھواں اٹھے گا
پار جو گزرے گی معلوم نہیں
اپنے دروازے کھلے رہنے دو

◆◆◆

# اس پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ

اس پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ
اس پیڑ کا پھیلاؤ، زمانوں میں بھی ہے، آج میں بھی
اس کی جڑیں ہیں
صدیوں سے یہاں لوگ ہر اک سمت سے آتے بھی
بچھڑتے بھی رہے ہیں
برگد کے تلے قبر پہ (کیا جانیے کیا دفن ہے!)
نذرانوں کے انبار لگتے ہیں، خوابیدہ ہے اس پیڑ کے نیچے کوئی مجذوب برہنہ
اور پیڑ پہ ہے بوم کا سایہ!
اے قبر پہ برگد کے تلے سوئے ہوئے شخص
تجھ ترانوں سے بہت اونچا اٹھا ہے
اس راہ سے تاریخ ابھی گزری ہے حافظ کی غزل گاتی ہوئی
سوکھے ہوئے اعضا پہ ترے ہنستی ہوئی
اب جن کو تناسل سے کوئی کام نہیں ہے

اے قبر پہ سوئے ہوئے مجذوب تری نیند میں
صحراؤں کی بو باس
آتی ہے تری سانس سے اس فقر کی آواز کہ ہے زیر و بم مرگ
وہ مرگ کہ ہے شرم کی تمثیل

افسوس کے دروازے پر اک عشق سیہ روز
کے مانند پڑا ہے
لو شخص نے پھر نیند کی دلدل میں سے جھانکا
تہمد بھی سنبھالا
اک نعرہ لگایا
حافظ کی غزل جس کی صدا گہرے کنوئیں میں سے اٹھی تھی
اس شخص نے پھر اس کو پکارا
پھر سلسلہ خواب جہاں ٹوٹا تھا دوبارہ ملایا
اور ناف کے پر پیچ مسائل میں ہوا گم

ہاں ناف میں (یا ناف کے پاتال میں) شاید
تجھ کو نظر آ جائے کبھی شہر کے آلام کا رعشہ
اس شہر میں اب دیکھنے کو آنکھ، نہ جینے کے لیے ہاتھ
نہ رونے کے لیے دل
کچھ لوگوں نے جو قحط کے ملبے پہ کھڑے دیکھتے تھے
اک گیت، محبت کا نیا گیت سر آغاز کیا ہے
برگد کی طرف آؤ، ذرا ہاتھ بڑھاؤ
گاتے ہوئے لوگو
اے شہر کے پاکیزہ ترینو
نغمے کی حلاوت سے وہ افسوں جو کسی خوف نے
برگد پہ لپیٹا ہے اتارو

اور خوف کو چپ چاپ نکل جانے دو ماضی کے کنارے
(اس خوف کی ہر لہر میں حافظ کی غزل ہے)
کیا چیز ہیں برگد کے پرندے
(کیا ان کی ہم آغوشی کا غل تم نے سنا ہے
ہر گھر کا کنواں ان کی عنایات سے پر ہے
اور ان کی ہوسناک نگاہوں نے
جوانی کے کئی ہار چرائے!)
گاتے رہو لوگو!
گاتے رہو یہ گیت کہ ٹوٹے گی تجابات کی وہ مہر
جو سانسوں پہ لگی ہے
اس گیت پہ لگی ہے
اس گیت سے پھر اپنی جواں عورتوں کے
سینوں پہ مہتاب کھلیں گے
اور پھولوں کے الہام سے
ڈھل جائیں گے پھر صحن ہمارے!

◆ ◆ ◆

# چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے

چلا آرہا ہوں سمندروں کے وصال سے
کئی لذتوں کا ستم لیے
جو سمندروں کے فسوں میں ہیں
مرا ذہن ہے وہ صنم لیے
وہی ریگ زار ہے سامنے
وہی ریگ زار کہ جس میں عشق کے آئنے
کسی دست غیب سے ٹوٹ کر
رہ تار جاں میں بکھر گئے
ابھی آرہا ہوں سمندروں کی مہک لیے
وہ تھپک لیے جو سمندروں کی نسیم میں
ہے ہزار رنگ سے خواب ہائے خنک لیے
چلا آرہا ہوں سمندروں کا نمک لیے

یہ برہنگی عظیم تیری دکھاؤں میں
(جو گداگری کا بہانہ ہے)
کوئی راہرو ہو تو اس سے راہ کی داستاں
میں سنوں، فسانہ سمندروں کا سناؤں میں
(کہ سمندروں کا فسانہ عشق کی گسترش کا فسانہ ہے)

یہ برہنگی جسے دیکھ کر بڑھیں دست و پا نہ کھلے زباں
نہ خیال ہی میں رہے تو اس
تو وہ ریگ زار کہ جیسے رہزن پیر ہو
جسے تاب راہزنی نہ ہو
کہ مثال طائر نیم جاں
جسے یاد بال و پری نہ ہو
کسی راہرو سے امید رحم و کرم لیے
میں بھرا ہوا ہوں سمندروں کے جلال سے
چلا آ رہا ہوں میں ساحلوں کا حشم لیے
ہے ابھی انہی کی طرف مرا در دل کھلا
کہ نسیم خندہ کو رہ ملے
مری تیرگی کو نگہ ملے
وہ سرور و سوز صدف ابھی مجھے یاد ہے
ابھی چاٹتی ہے سمندروں کی زباں مجھے
مرے پاؤں چھو کے نکل گئی کوئی موج ساز بکف ابھی
وہ حلاوتیں مرے ہست و بود میں بھر گئی
وہ جزیرے جن کے افق ہجوم سحر سے دید بہار تھے
وہ پرندے اپنی طلب میں جو سرکار تھے
وہ پرندے جن کی صفیر میں تھیں رسالتیں
ابھی اس صفیر کی جلوتیں مرے خوں میں ہیں
ابھی ذہن ہے وہ صنم لیے

جو سمندروں کے فسوں میں ہیں
چلا آ رہا ہوں سمندروں کے جمال سے
صدف و کنار کا غم لیے

◆◆◆

# ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے

صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے
جسم کے ساحل آشفتہ پر اک عشق کا مارا ہوا
انسان ہے آسودہ، مرے دل میں، سر ریگ تپاں
میں فقط اس کا قصیدہ خواں ہوں!
(ریت پر لیٹے ہوے شخص کا آوازہ بلند)
دور کی گندم وے صندل و خس لایا ہے
تاک کی شاخ پر اک قافلہ زنبوروں کا
تاک کی شاخ بھی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھی
کیسے زنبور ہمیشہ سے تمنا کے خداؤں کے حضور
سر بسجدہ میں مگر مشعل جاں لے کے ہر اک سمت رواں!

جونہی دن نکلے گا اور شہر
جواں میوہ فروشوں کی پکاروں سے چھلک اٹھے گا،
میں بھی ہر سو ترے مژگاں کے سفیروں کی طرح دوڑوں گا!
(دن نکل آیا تو شبنم کی رسالت کی صفیں تہہ ہوں گی
راستے دن کے سیہ جھوٹ سے لد جائیں گے
بھونکنا چھوڑ کے پھر کاٹنے لگ جائیں گے غم کے کتے

اور اس شہر کے دلشاد مسافر، جن پر
ان کے سائے سے بھی لرزہ طاری،
پیکر خواب کے مانند سر راہ پلٹ جائیں گے )
رات یوں چاہا مجھے تو نے کہ میں فرد نہیں
بلکہ آزادی کے دیوانوں کا جمگھٹ ہوں میں
رات یوں چاہا تجھے میں نے کہ تو فرد نہ ہو
بلکہ آئندہ ستاروں کا ہجوم
صبح کے سینے میں نیزے ٹوٹے
اور ہم رات کی خوشبوؤں سے بوجھل اٹھے

اب بھی اک جسم مرے جسم سے پیوستہ ہے
جیسے اس ریت پہ لیٹے ہوئے انساں کا قالب ہو یہی
جسم، میں جس کا قصیدہ خواں ہوں
دن نکل آئے گا زنبوروں کی سوغات گل و تاک
کی دہلیز پہ رکھی ہوگی،
وہ اٹھا لیں گے اسے چومیں گے
ایسی سوغات گل و تاک پہ کچھ بار نہیں!
انھی زنبوروں کی محنت کے پسینے سے درختوں کو ملی
تاب، کہ رویا دیکھیں
کسی دوشیزہ کا رویا جسے شیرینیٔ لب بار ہو
(زیبائی جہاں بھی ہو سلام

تیرے ہونٹوں کو دوام )
رات کے باغوں کی خوشبوؤں کو چھو کر آئے
زیست کی تازہ دمی ہست کی ندرت لائے
ان کے اک بوسے سے ہر لب میں نمو آئے گی
موت اس شہر سے دزدانہ پلٹ جائے گی

◆◆◆

# رات خیالوں میں گم

پھول کی پتی ٹھہر، رات کے دل پر ہے بار
رات خیالوں میں گم
طائرِ جاں پر نہ مار،
رات خیالوں میں گم
کونسی یادوں میں گم ہے شبِ تاریدہ مو؟
رنجِ مسافت کا طول
(جس کی ہے تو خود رسول!)
وقت کے چہرے کا رنگ؟
جو کبھی قرمز، کبھی زرد، کبھی لاجورد
(تو کہ سیاہی میں فرد
کوری میدان کی مرد)
راہ کی مہماں سرا؟ (سانس سے پستاں ترے
کیسے ہمکتے رہے!)
تاجروں کا قافلہ، اک نظر باز تھے
حیلوں سے تکتے رہے!
راہ کی مہماں سرا، خوف سے بستر بھی سنگ
وہم سے رویا بھی دنگ
نالہ درویش سے صبح کے پیکر پہ ضرب

(ختم تمنا کا کرب!)
عشق کا افسانہ گو ہرزہ گری سے نڈھال
ظلم کی شاخوں سے ژولیدہ زمانوں کی فال
حاشیہ مرگ پر رہروؤں کے نشاں
ریت کے جالوں میں گم
ریت سوالوں میں گم
(سر اٹھائے ذرا ہم تری دعوت منائیں جشن ارادت رچائیں)
کونسی یادوں میں گم ہے شب تاریدہ مو؟
ایک جزیرہ کہیں عیش وفا کا عدن
سحر زدہ مرد و زن رقص کناں کو بکو
ننگ بدن، تشنہ جاں
کہنے لگے وہ خدا کا ہمیں فرماں یہی،
سر درگوں میں ہو خوں، رقص کریں پھر بھی ہم
جشن ہے کیوں؟“
بجھتے گئے سب چراغ، زندہ رہا اک الاؤ
جس کی دہک سے زمیں اور ہوئی آتشیں اور ہوئی عنبریں
اور وہ تنہا دیار چاند سے بھی دور دست
جس میں اذاں زیر لب جس میں فغاں غم سے پست
ایک ہی ہو کا کھنڈر، جبر ریا رادبست
فکر کے مجذوب چپ، حرف کے دیوانے مست
(تجھ کو کوئی چھو سکے اب تو ہٹا آنکھ سیار جہاں کی سلیں)

سطح خدا آئنہ اور رخ نیستی
محض ہیولائے ہست

رات ذرا سر اٹھا، فرش سے چپیدہ تو
جیسے کنوئیں نبات!
رات سر اٹھا، ہم کہ نہیں دشت صفر
ہم کہ عدم بھی نہیں!
سیر تیری بے بہا اور تراہفت خواں
تاب میں کم بھی نہیں
ہاتھ مگر شل ترے، تیری قدم بھی نہیں
اور اگر ہوں تو کیا؟
صبح کے بلور پر کس کو میسر ثبات؟
رات ذرا سر اٹھا
اور نہ کوتاہ کر اپنی مسافت کی راہ
کیوں ہے خیالوں میں گم؟
کیسے خیالوں میں گم؟

◆ ◆ ◆